POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 24 - 25 June 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages
8

HAMARI
ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان
اشاعت کا 87واں سال

یکم تا ۷ جولائی ۲۰۲۶ء • شمارہ: ۲۵ • جلد: ۸۵

Date of Publication: 23-06-2026 • Price: 5/- • 1-7 July 2026 • Issue: 25 • Vol:85

صحتِ زبان (۴۶)

رؤف پاریکھ

اثرات یا آثار؟

سیّد سلیمان ندوی نے لکھا ہے:

''میں نے معارف میں ایک دفعہ اثر کی جمع اثرات لکھ دی تھی۔ میرے مخدوم دوست سید مقبول احمد صاحب صمدانی نے جو بڑے نستعلیق انشا پرداز اور نفاست پسند اہلِ قلم ہیں خط لکھ کر مجھے فوراً ٹوکا کہ عربی میں اثر کی جمع آثار ہے، اثرات نہیں۔ میں نے مذاقاً جواب دیا کہ میں نے وہ لفظ اردو میں لکھا ہے عربی میں نہیں۔ لیکن یہ مذاق میں ٹالنے والی بات نہیں، خدا جانے اور کتنے فضلاء اس قسم کی بِالارادہ غلطیوں کو لکھنے والے کی جہالت سمجھتے ہوں گے۔''[1]

ندوی صاحب سے زیادہ عربی کون جانتا تھا (انھوں نے ایک عربی بہ اردو لغت 'لغاتِ جدیدہ' بھی مرتب کی تھی) لیکن وہ اُن اصحاب میں سے تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ اردو نے جو تصرفات عربی میں کیے ہیں وہ اردو زبان کے مزاج اور تقاضوں کے مطابق ہیں لہٰذا انھیں تسلیم کیا جانا چاہیے۔

اثر اور آثار کی بحث میں ندوی صاحب نے مزید لکھا ہے کہ اردو میں آثار کے معنی 'قرینہ' کے ہیں، جیسے: آثار سے یہ معلوم ہوتا ہے اور اردو میں آثار پرانی یادگاروں کے معنی میں بھی ہے جیسے: آثارِ قدیمہ۔ اسی لیے جب اثر کا لفظ 'نتیجہ' یا 'تاثیر' کے معنی میں بولیں گے اس کی جمع اثرات بنائی جائے گی خواہ وہ عربی کے لحاظ سے کتنی ہی بے قاعدہ ہو[2]۔

پس اثر کی جمع 'اثرات' اردو کی حد تک بالکل درست ہے۔

دوکان یا دُکان؟

دکان عربی کا لفظ ہے اور اس کا عربی املا دُکّان ہے یعنی دال پر پیش اور کاف پر تشدید۔ لفظی معنی ہیں: چبوترا[3]۔ دکان سودا بِکنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اردو میں بغیر تشدید کے رائج ہے۔ اردو میں اس کا املا بعض لوگ دوکان لکھتے ہیں لیکن اس میں خطرہ یہ ہوتا ہے کہ دو کو الگ پڑھا جائے گا اور کان کو الگ اور کان ہوتے بھی دو ہی ہیں۔ لیکن یہ دونوں کانوں کا ذکر نہیں ہے بلکہ دُکان کا ذکر ہے یعنی وہ جگہ جہاں کوئی چیز بیچی جاتی ہے۔

'دوکان' کا یہ املا دراصل اس دور کی یادگار ہے جب پیش کو واو سے ظاہر کرتے تھے اور زیر کو 'ی' سے۔ اس طرح اعراب کو حروف کے ذریعے ظاہر کرنے کو اصطلاحاً اعراب بِالحروف کہتے ہیں، یعنی اعراب کو زیر، زبر، پیش کے بجائے حروف (واو اور 'ی') سے ظاہر کرنا۔ پہلے زیر کے بجائے 'ی' لکھتے تھے اور پیش کے بجائے واو۔ اسی لیے پرانے شعری متون میں اُدھر کو اودھر اور جِدھر کو جیدھر لکھا ہوا ملتا ہے، لیکن اودھر اور جیدھر پڑھنے سے مصرع اکثر بے وزن ہو جاتا ہے اور اُدھر اور جِدھر پڑھنے سے مصرع موزوں رہتا ہے۔ شاہ حاتم نے اپنے منتخب اور مختصر دیوان (جس کا نام انھوں نے دیوان زادہ رکھا تھا) کے دیباچے میں اس پرانی روشِ املا کی طرف اشارہ کیا ہے۔ حاتم نے جہاں اردو زبان اور شاعری میں بہت سی اصلاحات کیں اور اردو میں فارسی کے فعل اور حرف (مثلاً شگفتن، بردن، رفتن اور بر، در، و) کو لانا معیوب قرار دیا وہاں انھوں نے اردو املا میں بھی اصلاح کی کوشش کی، جیسا کہ 'دیوان زادہ' کے دیباچے میں ان اصلاحات کی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ تسبیح کو 'تسبی' اور صحیح کو 'صحی' نیز اُدھر کو 'اودھر' اور کدھر کو 'کیدھر' لکھنے کو موقوف کرنا چاہیے[4]۔ مگر بعض امور میں وہ عام رواج کے سبب مجبور تھے اور لکھا کہ ''بندہ دریں امر بمتابعتِ جمہور مجبور است''[5]۔ بات یہ ہے کہ زبان اور املا میں جو چیز رائج ہو جائے اس کو بدلنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

لیکن اُدھر اور کِدھر کا صحیح تلفظ اور املا واو (و) کے اور 'ی' کے بغیر ہی درست ہے۔ لفظ دُکان کا بھی یہی حال ہے یعنی اس میں واو نہیں ہے اور واو کے بجائے ضمہ (یعنی پیش) لکھنا چاہیے۔ اس غلط املا کے رائج ہونے کی ایک وجہ کاتبوں کی طرزِ کتابت بھی ہے۔ عبدالستار صدیقی کہتے ہیں:

''کچھ لفظ ایسے ہیں کہ ان میں 'و' لکھنے کی ضرورت نہیں یا 'و' لکھنا ان لفظوں میں غلط ہے مگر کاتب اکثر ان لفظوں میں بھی 'و' لکھ دیا کرتے ہیں۔ کاتبوں کے اس غلط طرزِ عمل کا یہ اثر ہے کہ محض طرزِ کتابت کی پیروی میں اردو میں بعض غلط لفظ رائج ہو گئے ہیں۔۔۔۔ اس کی بہترین مثال 'دوکان' ہے کہ اس میں واو لکھنا بھی غلط ہے اور بولنا بھی۔ اس غلطی کی تکرار کتابت میں اتنی ہوئی کہ بہت سے لوگ دُکان کو (جو صحیح ہے) عامیوں بلکہ جاہلوں کی بول چال سمجھنے لگے اور 'دوکان' کا لفظ (جو قطعاً غلط ہے) ان کی زبانوں پر بھی چل پڑا''[6]۔

اس کے بعد صدیقی صاحب نے شعری متون سے ثابت کیا ہے کہ دُکان کا املا دُکان ہی درست ہے، ملاحظہ کیجیے:

ع وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، وہ دکان اپنی بڑھا گئے

یہ مصرع بہادر شاہ ظفر سے منسوب ہے لیکن صدیقی صاحب نے ظفر کا نام نہیں لکھا، غالباً احتیاطاً (کیوں کہ بعض کے نزدیک یہ شعر ظفر کا نہیں ہے اور ظفر کے دیوان میں بھی درج نہیں ہے)۔ اور پھر آتش کا یہ شعر دیا ہے:

بازارِ دہر میں تری منزل کہاں نہ تھی
یوسف نہ جس میں ہو کوئی ایسی دکاں نہ تھی

اس کے بعد اسمٰعیل میرٹھی کی سند ہے:

دکاں بند کر کے رہا بیٹھ جو
تو دی اس نے بالکل ہی لُٹیا ڈُبو

پنڈت دتاتریہ کیفی نے لکھا ہے کہ پرانے طریقِ املا میں پیش کے بجائے واو لکھ دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ اس کلمے کا اصلی جز بن گیا اور لوگ دوکان بولنے لگے، لیکن واو کے بغیر لکھنا اور بولنا چاہیے[7]۔ اختر علی تاہری کے مطابق عربی میں دُکّان بتشدیدِ کاف ہے لیکن ''ہماری زبان پر بغیر تشدید رواں ہے''[8]۔ گویا صحیح املا دُکان ہے اور اسے واو کے ساتھ یعنی دوکان لکھنا یا اس طرح بولنا غلط ہے۔ اس میں واو لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

طبیعیات

طبیعیات یعنی فزکس (Physics) کا درست املا یہی ہے جو یہاں لکھا گیا ہے: ط ب ی ع ی ات، یعنی دو 'ی' کے ساتھ۔ بعض لوگ اسے طبیعات لکھتے ہیں یعنی ایک 'ی' سے، لیکن یہ غلط ہے۔ چونکہ یہ طبیعی سے ہے اور 'یات' لاحقہ برائے علم و فن ہے، جیسے اسلامیات (اسلام + یات)،

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کر سکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

نفسیات (نفس + یات) اور معاشیات (معاش + یات) وغیرہ اس لیے یہاں طبیعی + یات ہوگا۔ یہاں آخر میں دو 'ی' جمع ہوگئی ہیں اور اسی لیے اس 'ی' پر تشدید کے ساتھ یعنی طبیعیّات بھی لکھا جاتا ہے لیکن عام استعمال میں بغیر تشدید کے بھی ہے[9]۔

طُمانِینَت یا طَمانِیَت؟

اردو میں بعض عربی اور فارسی الفاظ کے املا میں اور بعض صورتوں میں معنی میں جو تصرف کیا گیا ہے اس پر اچھی خاصی بحث ہوتی رہی ہے۔ صاحبانِ 'قاموس الاغلاط' اکثر و بیشتر اس بات پر زور دیتے رہے کہ کوئی لفظ عربی میں جس طرح ہے اردو میں اسی طرح لکھنا اور بولنا چاہیے۔ لیکن کئی اہلِ علم کا یہ خیال تھا اور ہے کہ اردو والوں نے بعض عربی اور فارسی الفاظ میں جو تصرفات کر لیے ہیں وہ اردو کے مزاج اور صوتیات کے مطابق ہیں اور انھیں اردو کا تسلیم کر کے اردو کے رائج املا کے مطابق لکھنا اور بولنا چاہیے (اگرچہ اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہر غلطی اور ہر غلط عوامی تلفظ کو درست تسلیم کرلیا جائے)۔ لیکن جن تصرفات کو اہلِ علم نے اردو میں جائز اور درست قرار دیا ہے ان میں ایک لفظ ہے: طمانیت۔

عربی میں اس لفظ میں دو نون (ن) ہیں یعنی طمانینت، لیکن اردو میں ایک نون سے یعنی طمانیت رائج ہے۔ عربی میں طمانینت کے طوے (ط) پر پیش ہے اور اردو میں طوے (ط) پر زبر بولا جاتا ہے۔ صاحبِ فرہنگِ آصفیہ نے طُمانینت (طُ م ا ن ی نَ ت) درج کیا ہے لیکن اس کے معنی (اطمینان، دل جمعی، تسلیِ خاطر) لکھنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ لفظ طوے (ط) پر زبر کے ساتھ مشہور ہے مگر 'ط' پر پیش سے صحیح ہے اور دوسرے نون پر زبر ہے، اگرچہ 'صراح' [مشہور لغت] سے ایک نون کے حذف کا جواز نکلتا ہے (گویا دو کے بجاے ایک نون سے یعنی طمانیت) بھی درست ہے[10]۔

لیکن صاحبانِ 'قاموس الاغلاط' نے سیّد احمد دہلوی سے اختلاف کیا اور لکھا کہ ''طمانیت کہنا سخت غلطی ہے''۔ مزید لکھا کہ صاحبِ 'فرہنگِ آصفیہ' نے اگرچہ طمانیت کو غلط کہا ہے لیکن صراح کے حوالے سے ایک نون کے حذف کا جو جواز پیش کیا ہے وہ بھی غلط ہے (کیوں کہ بقول ان کے صراح میں یوں نہیں لکھا جیسا سید احمد دہلوی نے سمجھا ہے)[11]۔ اختر علی تلہری نے لکھا ہے کہ عربی میں طمانینت ہے لیکن اردو میں طمانیت رائج ہے۔ تلہری نے صاحبانِ 'قاموس الاغلاط' سے اختلاف کیا ہے اور لکھا ہے کہ طُمانینت اطمینان کے معنی میں عربی ہے لیکن اردو میں ایک نون حذف کر کے طمانیت بنا لیا گیا ہے اور اب بیشتر طمانیت ہی استعمال کیا جارہا ہے[12]۔

ڈاکٹر عابد پیشاوری (اصل نام شیام لال کالڑا) نے 'قاموس الاغلاط' کے خلاف پوری کتاب لکھ دی تھی۔ 'گاہے گاہے باز خواں' کے نام سے یہ کتاب دہلی سے تو ۱۹۹۴ء میں شائع ہوئی لیکن اس سے قبل انجمن ترقیِ اردو پاکستان (کراچی) کے سہ ماہی 'اردو' (شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۷ء، لغت نمبر، حصہ دوم) میں 'گاہے گاہے باز خواں: قاموس الاغلاط پر ایک نظر' کے عنوان سے شائع ہوچکی تھی، بلکہ وہ پورا شمارہ اسی کتاب پر مبنی تھا سوائے چند ادارتی صفحات کے جن میں ایک مفید کام ابوسلمان شاہ جہاں پوری نے یہ کیا تھا کہ قاموس الاغلاط کے مولفین سیّد مختار احمد (۱۹۴۱ء-۱۸۷۸ء) (جو سید عبداللہ ٹونکی کے صاحب زادے تھے) اور سیّد غلام مصطفیٰ ذہین حیدر آبادی (۱۹۳۱ء-۸۲/۱۸۸۱ء) کے حالاتِ زندگی دے دیے جو کہیں اور دست یاب نہیں تھے، سوائے نقوش کے شخصیات نمبر کے۔ ابوسلمان صاحب نے نقوش کا تو ذکر نہیں کیا لیکن بعض دیگر مآخذ بتائے ہیں۔ ان دونوں حضرات پر اردو میں کوئی تفصیلی کام نہیں ہوا اور ان پر کچھ معلومات بھی بالعموم نہیں ملتیں۔ اس لحاظ سے یہ چند صفحات بھی بہت قیمتی ہیں۔

معذرت کہ یہ جملۂ معترضہ نوکِ قلم سے ٹپک پڑا (لیکن یہ بھی ضروری تھا)، کہنا یہ تھا کہ عابد پیشاوری صاحب نے قاموس الاغلاط پر جو 'ایک نظر' ڈالی ہے وہ سراسر طنزیہ ہے اور ان کا نقطۂ نظر پوری کتاب میں یہی ہے کہ اردو والوں نے جو تصرفات عربی یا فارسی الفاظ میں کر لیے ہیں وہ اردو کی حد تک بالکل درست ہیں۔ البتہ کہیں کہیں عابد صاحب نے، بقول ابوسلمان صاحب کے، سوالیہ نشان چھوڑ دیا ہے۔ بہرحال، عابد پیشاوری یا عابد پشاوری (انجمن کے رسالے میں ان کے نام کے ہجے 'پشاوری' لکھے گئے ہیں اور دہلی سے مطبوعہ کتاب میں 'پیشاوری'، ویسے پشاور سے نسبت ہو تو پشاوری کہتے ہیں) نے لفظ طمانینت/طمانیت پر تبصرہ کرتے ہوئے پہلے 'قاموس الاغلاط' کے الفاظ دہرائے ہیں جو یہ ہیں: ''بالضم و کسرِ نونِ اول و سکونِ یا [ی]۔۔۔'' اس کے بعد عابد صاحب نے لکھا ہے: ''اس طرح کوئی نہیں بولتا۔ سب اسی طرح کہتے ہیں جسے غلط بتایا گیا ہے''[13]۔ گویا عابد صاحب کے خیال میں اردو میں طُمانینت نہیں بلکہ طَمانِیَت ہے۔

عابد پیشاوری سے پہلے رشید حسن خاں نے بھی 'قاموس الاغلاط' کا تجزیہ کیا تھا اور انھوں نے بھی لکھا ہے کہ اردو میں طمانیت ہے طوے پر زبر اور ایک نون کے ساتھ، کیوں کہ یہ لفظ طُمانینت اتنا ثقیل ہے کہ، بقول ان کے، اردو میں ''رائج ہو بھی نہیں سکتا تھا''[14]۔

گویا اردو میں طوے پر زبر کے ساتھ اور ایک نون کے ساتھ طَمانِیَت (طَ م ا نِ یَ ت) درست ہے۔ ہاں، عربی کی بات اور ہے۔ جب عربی بولیں گے اور عربی لکھیں گے تو یقیناً عربی کے قواعد پر عمل کریں گے، لیکن ابھی تو اردو لکھ رہے ہیں لہٰذا یہ طمانیت ہے کہ درست لکھ رہے ہیں۔ اور اس طمانیت کی ایک وجہ طوے پر زبر کا ہونا اور دوسری وجہ صرف ایک نون کا ہونا ہے۔ آسان جو ہوگیا، ہے نا!

حواشی:

۱ نقوشِ سلیمانی (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۷ء)، ص ۳۳۳ (دوسرا پاکستانی ایڈیشن)۔

۲ ایضاً۔

۳ مصباح اللغات (مرتبہ عبدالحفیظ بلیاوی) (لاہور: المصباح، سنہ ندارد)۔

۴ تفصیلات کے لیے دیکھیے: شیخ ظہورالدین حاتم، دیباچہ، دیوان زادہ (مرتبہ غلام حسین ذوالفقار)، (لاہور: مکتبۂ خیابانِ ادب، ۱۹۷۵ء)، ص ۴۰۔

۵ ایضاً۔

۶ مقالاتِ صدیقی، پہلا حصہ (مرتبہ مسلم صدیقی) (لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۳ء)، ص ۳۷۔

۷ کیفیہ (لاہور: مکتبہ معین الادب، ۱۹۵۰ء)، ص ۳۵۳۔ (دوسرا ایڈیشن)

۸ مقالاتِ تلہری (لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۰ء)، ص ۹۷۔

۹ اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد ۱۳ (کراچی: اردو لغت بورڈ، ۱۹۹۱ء)۔

۱۰ فرہنگِ آصفیہ (مرتبہ سید احمد دہلوی) (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۷۷ء)۔

۱۱ قاموس الاغلاط (مرتبہ مختار احمد و مولانا ذہین) (حیدرآباد دکن: مکتبۂ ابراہیمیہ، سنہ ندارد)، ص ۹۶، ۹۵۔

۱۲ مقالاتِ تلہری، محولۂ بالا، ص ۸۱۔

۱۳ گاہے گاہے باز خواں: قاموس الاغلاط (علامہ سید مختار احمد و مولانا ذہین) پر ایک نظر، مشمولہ سہ ماہی، اردو (انجمن ترقیِ اردو، کراچی)، شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۸۷ء، ص ۹۸۔

۱۴ زبان اور قواعد (دہلی: قومی کونسل براے فروغِ اردو، ۲۰۰۱ء)، ص ۱۵۳۔ (تیسرا ایڈیشن)

ریٹائرڈ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی-75270 (پاکستان)
E-mail: drraufparekh@yahoo.com

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

میرے مضامین (مجموعۂ مضامین و مقالات)	ڈاکٹر ماجد دیوبندی	300/-
نسخۂ حفیظ الدین احمد	اطہر فاروقی	1000/-
سرودِ عشق	شاہ رُخ جمال	200/-
گل دوگانہ	سیّد کاشف رضا	300/-
مشائخِ دہلی کی جامع تاریخ	پروفیسر شریف حسین قاسمی	700/-
مقالاتِ نظامی (پانچ جلدیں)	خلیق احمد نظامی	4500/-
نگینے لوگ (خاکوں کا مجموعہ)	معصوم مرادآبادی	250/-
ہمارا شہر اُس برس (گیتانجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	700/-
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا	سرورالہدیٰ	500/-
1857 کی اَن کہی حیرت انگیز داستانیں	شمس الاسلام	300/-
دیووں کا ظہور (الوک اگروال/ مینک اگروال)	مترجم: سیّد وجاہت مظہر	500/-
غزل اور فنِ غزل	ڈاکٹر نریش	200/-
فرہنگِ تلفظ: ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ	سیّد رضوان علی ندوی	
	رؤف پاریکھ	250/-
مشاہیرِ ادب کے خطوط رشید حسن خاں کے نام	ابراہیم افسر	600/-
منیب الرحمٰن کی ایک صدی	بیدار بخت/ انور احمد	400/-
اردو املا اور حروفِ تہجی: لسانیاتی تناظر	رؤف پاریکھ	300/-
رموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟	ڈاکٹر شمس بدایونی	300/-
غروبِ شہر کا وقت	اُسامہ صدیق	900/-
کچھ اُداس نظمیں	ہربنس مکھیا	300/-
میانِ من و تو (تحقیقی و تنقیدی مضامین)	پروفیسر شاہد کمال	500/-
میرا جنون اردو (خطبات و مضامین)	طاہر محمود	700/-
میر کی خودنوشت سوانح (نثار احمد فاروقی)	صدف فاطمہ	400/-
کلّیاتِ خطباتِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	400/-
آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر بشیر بدر	500/-
اداریے (مشفق خواجہ)	محمد صابر	500/-
انور عظیم کی ادبی کائنات	فیضان الحق	700/-
بچوں کا گلدستہ (پانچ جلدیں)	غلام حیدر	2400/-
تحقیق و توازن	ڈاکٹر نریش	250/-
تحقیقی مباحث	رؤف پاریکھ	300/-
چند فکری و تاریخی عنوانات	پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن	400/-
ریت سمادھی (گیتانجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	900/-
حکمِ سفر دیا تھا کیوں	شانتی ویرکول	200/-
عہدِ وسطیٰ کی ہندستانی تاریخ کے چند اہم پہلو	اقتدار عالم خاں	350/-
قدرت کا بدلا (موسم کا بدلاؤ)	سیّد ضیاء حیدر	600/-
کتابیاتِ حالی	ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد	300/-
یہ تو عشق کا ہے معاملہ	ڈاکٹر ہلال فرید	300/-
جب دیوں کے سر اُٹھے	ڈاکٹر ہلال فرید	360/-
سیر المنازل (مرزا سنگین بیگ)	شریف حسین قاسمی	600/-
محرابِ تمنا	فطرت انصاری	200/-
مکتوباتِ مولوی عبدالحق بنام مشاہیر...	میر حسین علی امام، یاسمین سلطانہ فاروقی	700/-
لفظ (کلیاتِ زہرا نگاہ)	زہرا نگاہ	500/-
In This Live Desolation (Autobiography of Akhtarul Iman)	ترجمہ: بیدار بخت	500/-

اردو زبان پر غفلت کے سایے؟

محمد عاصم کمال اعظمی

انسانی زندگی کی خوب صورتی یہ ہے کہ قدرت نے اسے جذبات اور احساسات دیے ہیں اور ان جذبات اور احساسات کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے زبان دی ہے اور اس زبان میں قوت گویائی بخشی ہے، اگر انسانی زندگی قوت گویائی سے خالی ہو جائے تو اس جہان رنگ و بو میں سب کچھ بے سود اور بے لطف ہو جائے۔

زبان انسانی کیفیات کی نقالی اور اس کی منتقلی کے لیے استعمال کی جاتی ہے، ورنہ انسان دم بخود اور کم قیمت ہو جائے، اب انسانی بولیاں ہی انسان کی پہچان اور اس کی شناخت بن گئی ہیں اور انسانی طبقات ان بولیوں اور لغات سے متعارف ہونے لگے، انھی زبانوں میں ایک خوب صورت اور خوب سیرت زبان کا سادہ نام 'اردو' ہے، یہ اردوے معلیٰ بھی بنی؛ مگر روز اول سے ہی اردو بن کر دلوں پر راج کرتی رہی، اس زبان نے دیگر زبانوں کی بہ نسبت تاریخ انسانی کے کلینڈر میں بہت کم جگہ پائی ہے؛ مگر اس کا حسن اور اس کے حسن کی جلوہ گری ایسی آفاقی اور ہمہ گیر ہے کہ بیان سے باہر ہے، کیوں کہ یہ زبان نہیں، احساس وخیالات کی ترجمان ہے، جذبات و کیفیات کو بیان کرنے کا سامان ہے، وجدان، لمس، خوشبو، معرفت، عکس اور غزل کا عنوان ہے۔

اردو زبان نے ہندستان کے غلام دور میں ترقی پائی اور غلام انسانوں کو اپنے آقا و مالکوں کے سامنے سر بلند ہونے کا حوصلہ دیا، اس نے غلام قوم کو آزادی کے نعرے دیے، دنیا میں محبت اور معرفت کے بیانیے دیے، وہ اہلِ دل کی صدا اور دل والوں کی ہمراز بن گئی، اس نے گیت گائے، وطنیت کے ترانے سنائے، آشفتہ بیاں اور حدی خواں ہوئی، قصہ گوئی اور رت جگے کا سامان ہوئی، عاجز نے اس میں اپنا درد پایا، عاشق نے عشق ومستی وسرور، امیر وشاہزادوں کے لیے فخر ومباہات کے دعوے، شعرا کے لیے پروازِ تخیل، اہل ادب کے لیے ادبی شہ پارے، مورخ کے لیے ہمہ جہتی اور فلسفی کا فلسفہ ثابت ہوئی، غیرت مند کا زعم، اور انا پرست کے اصول، ماضی کے شاندار کارناموں کی داستان تو حال کی حسرتوں کا اس میں حساب بھی ہے۔

اردو نے کم عمری میں بہت سی دہلیز کو چھوا اور بہت سے وجود کو مس کیا، بہت سے بیابانوں میں صحرا نوردی کی، کیوں کہ اس کا دامن اگرچہ اپنے ذاتی اور خانگی خوشوں اور کلیوں سے زیادہ آباد نہیں، مگر اس کی مجموعی کیفیت سحر آفریں اور جادو اثر ہے، اس نے جس کو مس کیا اپنا گرویدہ اور عاشق زار بنا ڈالا اور اپنے حسن و ادا اور ناز و نزاکت کے دام میں ہمیشہ کے لیے قیدی بنا لیا، وہ آج انسانی آبادی کے لاکھوں لوگوں کا سہارا اور ان کی طاقت ہے، ان کا مان اور ان کی پہچان ہے، وہ ایک زندہ و تابندہ زبان ہے۔ سلیم احمد صدیقی نے کیا خوب کہا ہے:

فضا کیسی بھی ہو وہ رنگ اپنا گھول لیتا ہے
سلیقے سے زمانے میں جو اردو بول لیتا ہے

مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانی آبادی کی طرح زبانوں پر بھی عروج و زوال کے اثرات مرتب ہوتے ہیں، اور کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ وہ زبانِ اردو جس نے اپنی جاے پیدائش (ہندستان) کے اس دور میں

اردو زبان نے ہندستان کے غلام دور میں ترقی پائی اور غلام انسانوں کو اپنے آقا و مالکوں کے سامنے سر بلند ہونے کا حوصلہ دیا، اس نے غلام قوم کو آزادی کے نعرے دیے، دنیا میں محبت اور معرفت کے بیانیے دیے، وہ اہلِ دل کی صدا اور دل والوں کی ہمراز بن گئی، اس نے گیت گائے، وطنیت کے ترانے سنائے، آشفتہ بیاں اور حدی خواں ہوئی، قصہ گوئی اور رت جگے کا سامان ہوئی، عاجز نے اس میں اپنا درد پایا، عاشق نے عشق ومستی وسرور، امیر وشاہزادوں کے لیے فخر ومباہات کے دعوے، شعرا کے لیے پروازِ تخیل، اہلِ ادب کے لیے ادبی شہ پارے، مورخ کے لیے ہمہ جہتی اور فلسفی کا فلسفہ ثابت ہوئی، غیرت مند کا زعم اور انا پرست کے اصول، ماضی کے شاندار کارناموں کی داستان تو حال کی حسرتوں کا اس میں حساب بھی ہے۔

عروج وکمال پایا اور اس کا عنفوان شباب اپنی آخری حد کو پہنچا جب اس ملک کا ذرہ ذرہ ایک ظالم وجابر اور متعصب ومتشدد سامراج کے زیر تسلط تھا، جو ایسا خود غرض اور انا پرست تھا کہ اپنی تہذیب، اپنی زبان اور اپنے وجود کے سوا تمام چیزوں کو ہیچ اور کمتر سمجھتا تھا، وہ بے رحم انگریز سامراج اردو کے جمالِ جہاں آرا کو کیوں کر سمجھ سکتا تھا، اور سمجھتا بھی تو کیوں کر برداشت کر سکتا تھا، جب کہ اس کے لازوال اقتدار کے خلاف اٹھنے والے بلند بانگ نعرہاے حب الوطنی، اخبارات کی سرخیاں، دستی پرچے، دیواروں کے نوشتے اور تحریکوں اور تنظیموں کے جھنڈے اس زبان کی پشت پناہی سے طاقت پاتے تھے؛ اس لیے اس سخت گیر نظامِ حکومت نے جہاں اہل ہند کو ظلم وجبر کا نشانہ بنایا وہیں یہ کم عمر ونازک وجود زبان بھی تختۂ مشق بنی؛ مگر بعد کے حالات نے واضح کیا کہ اِس زبان کے ساتھ زیادتی کی تصویر دور غلامی سے کہیں زیادہ آزادی کے بعد خوف ناک ہوگئی۔ ملک کی آزادی کے بعد دل کھول کر اس پر ظلم ڈھایا گیا، جبراً ایک خاص مذہب کا چولا پہنا کر سوتیلا سلوک روا رکھا جانے لگا، اس کو اجنبی اور غیر ملکی کا الزام دیا گیا اور دن گزرنے کے ساتھ اس زبان کا دائرہ تنگ کیا جانے لگا، حتی کہ اس کو ملک سے نکال باہر کرنے کی کوششیں اور تحریکیں چلیں، اس کے نشانات اور نقوش وتاثرات محو کر دیے جانے کے ہنگامے کھڑے کیے جانے لگے۔ اقبال اشہر نے اپنی مقبول ومشہور نظم 'اردو ہے میرا نام میں خسرو کی پہیلی' میں اس جانب اشارے کیے ہیں:

کیوں مجھ کو بناتے ہو تعصب کا نشانہ
میں نے تو کبھی خود کو مسلماں نہیں مانا
دیکھا تھا کبھی میں نے بھی خوشیوں کا زمانہ
اپنے ہی وطن میں ہوں مگر آج اکیلی

('اردو ہے میرا نام' میں 'خسرو کی پہیلی')

اردو کو مٹانے اور ختم کرنے کی کوشش عام زندگی اور علمی وادبی حلقوں تک ہی محدود نہ رہی؛ بلکہ یہ عام وخاص کا موضوعِ ہدف بن گئی ہے اور اس زبان نے جس خطۂ ارضی میں سب سے زیادہ گل کاریاں کیں اور حسن و ادا کے جلوے بکھیرے، اور جو خطہ سب سے زیادہ مالا مال ہوا۔ زمانے کی ستم ظریفی یا نصیبے کی کمتری کہیے کہ آج وہیں اس کو اس کے دستوری حق سے محروم کرنے کی کوششیں جاری ہیں؛ حتیٰ کہ جب اس زبان کے ساتھ حد سے زیادہ کشاکش ہونے لگی اور اس کو روندنے اور فنا کرنے کے دعوے کیے جانے لگے، اور اس کے متوالوں نے دیکھا کہ اس کے وجود پر بن آئی ہے تو انھوں نے تاریخ کی اس مظلوم ترین زبان کو عدالت کے کٹہرے میں انصاف دلانے کے لیے کھڑا کیا، پھر ملک کی عدالتِ عظمیٰ نے اس کی جان بچائی اور اس کو باعزت بری کرتے ہوئے اور اس کے سر سے غیر ملکی کا الزام رفع کرتے ہوئے اسی ملک کی پیداوار قرار دیا، اور اس کے وجود کو تحفظ فراہم کیے جانے کا حکم صادر کیا، جس کے لیے اس زبان اور اس کے شیدائیوں کو عدالت کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

سیاسی، سماجی اور عرفی حیثیتوں کے علاوہ اس کی مزید تیرہ بختی دیکھیے کہ اس زبان کو جس مذہب کے آنگن میں جبری اتار کر اور جس سے تعلق کے الزام میں اُس پر ہر ظلم وتشدد کو روا رکھا جا رہا ہے، اب صورتِ حال یہ ہے کہ اس مذہب کے ماننے والے عام لوگ بھی اس سے اپنا دامن بچاتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور ان کی جانب سے بھی اس کو بے اعتنائی اور بے رخی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، بقول کاظم بنارسی:

تھا عرش پہ اک روز دماغِ اردو
پامالِ خزاں آج ہے باغِ اردو
غفلت تو ذرا قوم کی دیکھو کاظم
وہ سوتی ہے بجھتا ہے چراغِ اردو

اس زبان کے ساتھ سوتیلے پن کا یہ رویہ اس لیے ہے کہ (غلط گمانی میں) اِسے مسلمانوں کی زبان سمجھا جا رہا ہے، حالاں کہ یہ گنگا جمنی ماحول میں مشترکہ تہذیب کی حامل اور عہد ووفا کی پاس دار ہے، یہ ایک روایت ہے، ایک خوب صورت وراثت ہے، اس کا دامن روزِ آغاز سے مالا مال اور اس کا سفرِ حیات توشے سے بھرپور ہے، وہ اس ملک کے ہر امن پسند اور علم دوست وادب نواز کی ذمے داری ہے، اس کی حفاظت، اس کی صیانت سب کا مشترکہ فریضہ ہے، اس کی بقا اور اس کا تحفظ یقینی بنانے کی ضرورت ہے؛ کیوں کہ اگر محبت والفت کی یہ زبان مٹ گئی تو ایک تہذیب اور ایک عہد کا خاتمہ مانا جائے گا اور ایسا خسارہ ہوگا جو نا قابل تلافی ہوگا۔ اگر یہی حال رہا تو اردو زبان پر غفلت کے اندھیرے بڑھتے جائیں گے جس سے اس کے مستقبل پر سوالیہ نشان قائم ہو جائے گا۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے بہت پہلے بالکل درست کہا تھا:

شہد وشکر سے شیریں اردو زباں ہماری
ہوتی ہے جس کے بولے میٹھی زباں ہماری!

E-mail: abuamrakamal@gmail.com

اردو دُنیا

نئے ڈگری کالجوں میں اردو اور میتھلی کی تعلیم کا مسئلہ حل

پٹنہ (آئی این این)۔ ریاست میں قائم کیے گئے 211 نئے ڈگری کالجوں میں اگلے تعلیمی سیشن سے اردو اور میتھلی کی پڑھائی ہوگی۔ گورنر اور چانسلر سیّد عطا حسنین نے محکمۂ ہائر ایجوکیشن کو ان مضامین کو نصاب میں شامل کرنے کے لیے ضروری کارروائی کرنے کا حکم دیا ہے۔

یکم جولائی سے نئے ڈگری کالجوں میں جن چھے مضامین کی تعلیم شروع ہورہی ہے اُن میں ہندی، انگریزی، معاشیات، تاریخ، سیاسیات اور سماجیات شامل ہیں۔ گورنر سکریٹریٹ کے مطابق گورنر اور چانسلر سیّد عطا حسنین نے وائس چانسلر کو حکم دیا ہے کہ وہ اس سیشن سے شروع ہونے والے نئے ڈگری کالجوں میں چھے مضامین پڑھانے کی تمام تر تیاریوں کو یقینی بنائیں۔ وائس چانسلروں کو یہ بھی ہدایت دی گئی ہے کہ وہ ان ڈگری کالجوں میں نیشنل سروس اسکیم (این ایس ایس) اور نیشنل کیڈٹ کور (این سی سی) سے متعلق سرگرمیوں کو فروغ دیں۔ واضح رہے کہ آنے والے وقت میں چار سالہ انڈر گریجویٹ پروگرام کے چوتھے سمسٹر میں استعداد بڑھانے کے کورس کے حصے کے طور پر ریاستی یونیورسٹیوں میں نئی نیشنل سروس اسکیم کا نصاب نافذ کیا جائے گا۔

(انقلاب۔ پٹنہ)

اردو صرف زبان نہیں، ہماری مشترکہ تہذیب و ثقافت اور قومی یکجہتی کی پہچان ہے: ڈی ایم

دربھنگہ (20 مئی)۔ کلکٹریٹ میں واقع ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کانفرنس ہال میں بدھ کو اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومتِ بہار ضلع اردو سیل کے زیرِ اہتمام اردو داں طلبہ و طالبات حوصلہ افزائی ریاستی اسکیم کے تحت تقریری مقابلے کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کا افتتاح ڈی ایم کوشل کمار، ڈپٹی ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و تعلقاتِ عامہ ستیندر پرساد اور ضلع اقلیتی فلاح افسر آنند کمار نے مشترکہ طور پر شمع روشن کر کے کیا۔

اس موقعے پر ڈی ایم نے اپنے خطاب میں کہا کہ یہ محض تقریری مقابلہ نہیں بلکہ ہمارے سماج کی ثقافتی خوشحالی، لسانی وراثت اور نوجوان صلاحیتوں کے احترام کا جشن ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ مقابلہ یقیناً طلبہ کی شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کرے گا۔ ڈی ایم نے کہا کہ اردو زبان صرف ایک زبان نہیں بلکہ ہماری مشترکہ ثقافت، تہذیب، بھائی چارہ اور قومی یکجہتی کی خوب صورت پہچان ہے۔ انھوں نے کہا کہ تقریری مقابلہ صرف اسٹیج پر بولنے کا موقع نہیں ہوتا بلکہ یہ خود اعتمادی، اظہارِ خیال کی صلاحیت، علم اور قیادت کی خوبیوں کو فروغ دینے کا ذریعہ بھی ہے۔ انھوں نے طالبات کی بطورِ خاص حوصلہ افزائی کی۔ افتتاحی تقریب کی نظامت اردو مترجم ڈاکٹر جسیم الدین نے اور تقریری مقابلے کی نظامت ڈاکٹر محمد حسان نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عالمگیر شبنم، حافظ محمد ابوشحمہ (صدر ضلع اوقاف کمیٹی دربھنگہ)، ڈاکٹر مطیع الرحمٰن وغیرہ نے خطاب کیا۔

تقریری مقابلہ تین گروپ میں منعقد ہوا۔ میٹرک کے تحت بشریٰ فہیم (اول)، عفت پروین، درخشاں صائمہ، محمد عدنان (دوم)، محمد ارسلان رضا، رضا فاطمہ، صفوان قمر اور شاداب عالم نے (سوم) مقام حاصل کیا۔ انھوں نے 'اردو زبان، قومی یکجہتی اور ہم آہنگی کی مثال' اور 'تعلیم و تربیت کی اہمیت' پر اپنی تقریری صلاحیت کا مظاہرہ کیا۔

انٹر سطح کے مقابلے میں محمد اطہر (اول)، توفیق اقبال، یاسر احمد، خبیب رحیم (دوم)، منتشا پروین، عبدالبر، محمد سلمان اور امینہ خاتون نے سوم مقام حاصل کیا۔ انھوں نے 'ادب معاشرے کا آئینہ' اور 'خواتین کی تعلیم و خودمختاری' عنوان پر تقریر کی۔ گریجویشن سطح کے مقابلے میں نرگس فاطمہ (اول)، امِ فاطمہ، سعدیہ قمر اور خورشید عالم (دوم)، محمد عامر سلیم، محمد خورشید عالم، شاہنواز عالم اور ارشاد عالم نے (سوم) مقام حاصل کیا۔ انھوں نے 'اردو ادب میں خواتین کا حصہ' اور 'کمپیوٹر اور اردو زبان' کے تحت اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔

شرکا کو مہمانوں کے ہاتھوں توصیفی سند سے بھی نوازا گیا۔ ڈاکٹر مطیع الرحمٰن، عارف اقبال اور ڈاکٹر عروسہ یاسمین بطورِ حکم موجود تھے جب کہ ڈاکٹر مجاہد الاسلام اور دیگر بطورِ خاص موجود تھے۔ ضلع اقلیتی فلاح افسر آنند کمار نے مہمانوں کا استقبال کیا جب کہ ڈاکٹر جسیم الدین کے کلماتِ تشکر پر پروگرام کا اختتام عمل میں آیا۔ (انقلاب۔ دہلی)

اردو اکادمی دہلی کے زیرِ اہتمام بعنوان 'صحافیوں کی ایک شام: شاعری کے نام' مشاعرہ

نئی دہلی (4 جون)۔ اردو اکادمی، دہلی کے زیرِ اہتمام 'صحافیوں کی ایک شام: شاعری کے نام' کے عنوان سے ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں صحافیوں، ادیبوں، شاعروں، طلبہ اور اردو زبان و ادب کے شائقین نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ مشاعرے کی صدارت روزنامہ 'انقلاب' کے سابق اڈیٹر شکیل حسن شمسی نے جب کہ نظامت معین شاداب نے کی۔ تقریب کے آغاز میں اردو کے نامور شاعر بشیر بدر کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کی گراں قدر ادبی خدمات اور منتخب شاعری پر گفتگو کی گئی۔

افتتاحی خطاب میں ڈاکٹر شفیع ایوب نے اردو اور ہندی صحافت و ادب کی مشترکہ اور تابناک روایت پر تفصیلی اظہارِ خیال کیا۔ انھوں نے دونوں زبانوں کی ادبی صحافت کے حسین امتزاج کو ایک طلوع ہوتے سورج سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا کہ اس کی روشنی میں سچائی کو زیادہ واضح انداز میں دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ ناظمِ مشاعرہ معین شاداب نے صحافت اور شاعری کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے صحافت کو 'عجلت میں لکھا ہوا ادب' قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ صحافت اور ادب کا رشتہ ہمیشہ سے مضبوط اور ناگزیر رہا ہے۔ اس موقعے پر دہلی کے صحافی شعرا نے اپنا منتخب کلام پیش کر کے سامعین کو محظوظ کیا۔ مشاعرے میں شکیل حسن شمسی، سلیم شیرازی، تحسین منور، معین شاداب، ڈاکٹر شفیع ایوب، ارشد ندیم، ضمیر ہاشمی، امیر امروہوی، ڈاکٹر فرمان چودھری، نعیم ہندوستانی، ڈاکٹر شعیب رضا فاطمی، رؤف رامش، ڈاکٹر منور حسن کمال اور مبارک قاسمی نے شرکت کی۔ (انقلاب۔ دہلی)

اردو جرنلزم کورس کے داخلہ امتحان سے متعلق تنازع ہائی کورٹ میں

نئی دہلی (20 مئی)۔ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ماس کمیونکیشن میں اردو جرنلزم کورس کے داخلے کے امتحان سے متعلق تنازع نے اب قانونی رخ اختیار کرلیا ہے۔ امتحان کے اسکرپٹ سے متعلق معاملے کی سماعت کرتے ہوئے دہلی ہائی کورٹ نے انسٹی ٹیوٹ کو نوٹس جاری کرتے ہوئے ایک ہفتے کے اندر جواب طلب کیا ہے۔ اس تنازع نے ہندی اور اردو زبانوں کے حوالے سے ایک نئی بحث چھیڑ دی ہے۔ درخواست گزاروں کا الزام ہے کہ اردو جرنلزم کورس کے داخلہ امتحان میں رسمِ خط سے متعلق تبدیلیوں اور ضابطے سے اردو زبان کے طلبہ کے لیے مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ اردو صحافت جیسے کورس کو زبان اور اس کے اصل رسمِ خط کا احترام کرنا چاہیے۔ طلبہ کا یہ بھی ماننا ہے کہ امتحانی عمل میں وضاحت کی کمی بہت سے امیدواروں کے مستقبل کو متاثر کرسکتی ہے۔

درخواست گزار طلبہ کی نمائندگی کرتے ہوئے ایڈوکیٹ ابھیشیک نے کہا کہ یہ معاملہ صرف ایک امتحان تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق لسانی شناخت، مساوی مواقع اور تعلیم کے حق سے بھی ہے۔ انھوں نے عدالت پر زور دیا کہ وہ طلبہ کے مفادات کو مدِنظر رکھتے ہوئے حساسیت کے ساتھ اس معاملے کا فیصلہ کرے۔ اس تنازع نے تعلیم اور میڈیا کے شعبوں میں گرما گرم بحث چھیڑ دی ہے۔ بہت سے ماہرین کا خیال ہے کہ ہندستان جیسے کثیر لسانی ملک میں زبانوں اور رسمِ خط کا احترام برقرار رکھنا بہت ضروری ہے۔ لسانی تنوع کا تحفظ، خاص طور پر صحافت جیسے شعبوں میں جمہوری اقدار کے لیے انتہائی اہم سمجھا جاتا ہے۔ طلبہ کے وکیل نے کہا کہ اس کیس میں کچھ طلبہ شامل ہیں جنھوں نے آئی آئی ایم سی میں اردو صحافت کے لیے داخلہ فارم بھرے تھے۔ آئی آئی ایم سی نے ابتدائی طور پر 27 اپریل کو ایک نوٹس جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ طلبہ اردو صحافت میں پی جی ڈپلوما میں داخلہ حاصل کرنے کے لیے اردو اور دیوناگری دونوں زبانوں میں امتحان دے سکتے ہیں۔ تاہم 6 مئی کو ایک نیا نوٹیفکیشن جاری کیا گیا جس میں کہا گیا کہ امتحان صرف اردو میں لیا جائے گا جس میں ہندی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ بہت سے طلبہ جنھوں نے اپنی فیس ادا کی تھی اور دیوناگری میں امتحان دینا چاہتے تھے، انھوں نے اب ہائی کورٹ سے رجوع کیا ہے۔ (انقلاب۔ دہلی)

اردو کی بقا کے لیے صرف دعوے نہیں محنت کی ضرورت

حیدرآباد (12 مئی)۔ ادارہ ادبِ اسلامی فرسٹ لانسرز کے زیرِ اہتمام 10 مئی 2026 کی شب ہل کریسنٹ اپارٹمنٹ، مرادنگر، حیدرآباد میں ادبی اجلاس و محفلِ شعر کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس موقعے پر خیر مقدمی تقریر کرتے ہوئے صدر ادارہ ادبِ اسلامی نجیب احمد نجیب نے کہا کہ ایسی محفلیں اردو ادب کی بقا و فروغ کی ضامن ہوتی ہیں۔ ان شاء اللہ ہر ماہ ادبی اجلاس و محفلِ شعر اور ہر سال ایک سالانہ کل ہند مشاعرے کا انعقاد عمل میں لایا جائے گا۔ اللہ کے رسولؐ نے مہمان نوازی کو ایمان کا جز قرار دیا اور فرمایا کہ مہمان کی آمد فیوض و برکات کا سرچشمہ ہوتی ہیں۔ صدرِ محفل ڈاکٹر رؤف خیر نے مہمانِ خصوصی جناب ندیم راعی کا تعارف پیش کیا اور اپنا افسانہ سنایا۔ مرادآباد سے تشریف لائے ممتاز مہمان افسانہ نگار جناب ندیم راعی کا خیر مقدم کیا گیا، انھیں شال پوشی کرتے ہوئے تہنیت پیش کی گئی۔ اس موقعے پر جناب ندیم راعی نے اپنی نثری تخلیق پیش کی۔ جناب ابونبیل خواجہ مسیح الدین (نائب صدر ادارہ ادبِ اسلامی جنوبی ہند) نے اپنا نثری شہ پارہ پیش کیا۔ جناب نجیب احمد نجیب نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ ممتاز شاعر شکیل حیدر کانپوری نے نعتِ رسولؐ کا نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ مدعو شعراے کرام میں شاعر خلیج جلیل نظامی، سیف نظامی، ارشد شرفی، شکیل حیدر کانپوری، ابونبیل خواجہ مسیح الدین، طاہر گلشن آبادی، افتخار عابد، فیصل وارثی، رفیق جگر اور ظہور ظہیر آبادی نے کلام سنایا۔ درمیان میں طنز و مزاح کے ممتاز شعرا ڈاکٹر علیم خاں فلکی، لطیف الدین لطیف اور صاحبِ خانہ نجیب احمد نجیب نے اپنے کلام سے محفل کو زعفران زار بنایا۔ (رہنماے دکن۔ حیدرآباد)

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام فخر الدین علی احمد یادگاری خطبے کا انعقاد

نئی دہلی (پریس ریلیز، 30 مئی)۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے ایوانِ غالب میں 30 مئی کو شام 5 بجے فخر الدین علی احمد یادگاری خطبہ 'ہماری تہذیب کے مشترک پہلو' کے عنوان سے پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر مہمان مقرر اور معروف مورخ جناب سہیل ہاشمی نے خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کوئی تہذیب خالص نہیں ہوتی خصوصاً ہمارے ملک میں تو لباس، رہن سہن اور طرزِ تعمیر میں مختلف تہذیبوں کا رنگ شامل ہے۔ یہ رنگ اس طرح شامل ہوگیا ہے کہ جب تک ان کو ... (بقیہ صفحہ 7 پر)

انجمن تحریکِ اُردو کے زیرِ اہتمام تعزیتی نشست

ڈاکٹر احمد سجاد اُردو علم وادب کا ایک روشن باب تھے: اے. علام

رانچی (30اپریل)۔ دنیائے اُردو کے معتبر اور معزز استاد، علمی و ادبی رہنما اور دینی و ملّی رہبر پروفیسر احمد سجاد کے انتقالِ پُر ملال پر انجمن تحریکِ اُردو جھارکھنڈ کی جانب سے مورخہ 29 اپریل 2026 بروزِ بدھ تعزیتی نشست کا انعقاد مقامی انجمن پلازہ مسافر خانہ ہال، رانچی میں بعد نمازِ عصر تا مغرب کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت جھارکھنڈ ہائی کورٹ کے سینئر ایڈوکیٹ جناب اے. علام اور نظامت انجمن کے نائب صدر جناب سہیل سعید نے فرمائی۔ جناب اے. علام نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ ڈاکٹر احمد سجاد کی علمی وادبی اور ملّی خدمات سے بہت حد تک واقف ہوں۔ آج ان کے نہ ہونے کا شدید احساس ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور انھیں اس کا بہترین اجر عطا فرمائے۔ صدر انجمن ڈاکٹر وکیل احمد رضوی نے کہا کہ مرحوم بڑے مخلص اور مشفق استاد اور انسان تھے۔ ان کا انفرادی اور مخصوص انداز لوگوں کو ان سے بہت قریب کردیا کرتا تھا۔ وہ ایک اچھے مقرر، بہترین مصنف اور باکمال منتظم تھے۔ تصنیف وتالیف کا یہ حال تھا کہ وہ 33 برس کی جواں عمری 1972 سے لے کر گزشتہ 2020-21 تک متواتر لکھتے پڑھتے رہے، پھر بیماری اور نقاہت کے سبب ان کا کام متاثر ہوا۔ مرحوم تعمیری ادب کے بنیاد گزاروں میں سے تھے۔ رانچی یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اُردو اور ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز کی حیثیت سے انھوں نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی دو درجن سے زائد کتابیں شائع ہوچکی ہیں اور چند زیرِ طبع بھی ہیں۔ انھوں نے جماعتِ اسلامی، انجمن ترقی اردو اور ملّی تعلیمی مشن میں بھی بڑا نمایاں کردار ادا کیا۔

انجمن کے نائب صدر جناب سہیل سعید نے نشست کی کامیاب نظامت کے دوران بڑے علمی ومعیاری انداز میں ڈاکٹر احمد سجاد کی علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالی اور انھیں علم وادب کا ایک مضبوط ستون قرار دیتے ہوئے کہا کہ وہ اکثر علمی وادبی محفلوں کی جان ہوا کرتے تھے اور ان کے انفرادی اندازِ گفتگو اور مخصوص اندازِ فکر سے سامعین بڑے متاثر ہوتے تھے۔ انجمن کے نائب صدر جناب جمیل اصغر نے ان سے اپنی گہری وابستگی کے ساتھ ساتھ زمانۂ طالبِ علمی سے ہی ان کے مشفقانہ کردار پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انجمن کے جنرل سکریٹری جناب اقبال احمد نے بھی مرحوم کے تعلیم وتعلم کے حوالے سے مخلصانہ اور مشفقانہ حسنِ سلوک کا تفصیلی ذکر کیا۔ انجینئر عزیز حمزہ پوری صدر حلقۂ ادب جھارکھنڈ (انجمن تحریکِ اُردو) نے ان کی علمی وادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ آج اس غم وحزن کے ماحول میں ہمیں اس بات کی خوشی کا بھی احساس ہو رہا ہے کہ حلقۂ ادب کے زیرِ اہتمام ان کی زندگی میں ہی 30 اپریل 2023 کو پریس کلب آف رانچی میں ایک شاندار سمینار کا انعقاد کیا گیا تھا اور ان کی بڑی ستائش بھی کی تھی۔ اس موقعے پر سیّد اعجاز احمد نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے اپنے والد مرحوم مولانا جمیل اختر سے ان کی گہری وابستگی کا ذکر کیا اور اپنے تخلیق کردہ چند تاثراتی اشعار پڑھے۔ ان کے علاوہ مرحوم کی خدمات پر اپنے تاثرات بیان کرنے اور خراجِ عقیدت پیش کرنے والوں میں جوائنٹ سکریٹری جناب مہتاب عالم کے علاوہ جناب سبحان اختر، قاضی حافظ ابوالکلام، محمد معین الدین، شیخ محمد عمر ایڈوکیٹ، جناب نہال سریادی، شکیل احمد، طفیل جاوید اور فاروق اعظم کے علاوہ خواتین شرکا میں ثمینہ خاتون، وحیدہ خاتون، نسرین پروین، ثنا پروین، شگفتہ پروین، مسکان پروین اور راحب جہاں وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ (روزنامہ 'پندار'۔ پٹنہ)

☆☆☆

رفتید ولے نہ از دلِ ما

کرشن لال نارنگ ساقی

نئی دہلی۔ اردو زبان وادب کے مخلص خدمت گار، معروف ناشر، ادیب اور سماجی شخصیت کرشن لال نارنگ ساقی 89 برس کی عمر میں 5 جون 2026 کو انتقال کرگئے۔ ان کے انتقال کی خبر سے اردو ادبی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی ہے اور اہلِ قلم نے اسے اردو دنیا کا بڑا نقصان قرار دیا ہے۔ کرشن لال نارنگ ساقی 24 اگست 1936 کو پنجاب کے ضلع فیروزپور کے گاؤں سوڑھی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے آبائی علاقے میں حاصل کی جب کہ ہائی اسکول اور بی اے کی تعلیم فیروزپور میں مکمل کی۔ طالبِ علمی کے زمانے میں انھوں نے 'ساقی' کے نام سے ایک ادبی رسالہ جاری کیا جس کے بعد یہی تخلص ان کی شناخت کا حصہ بن گیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ کاروباری میدان سے وابستہ ہوئے۔ ابتدا میں چنڈی گڑھ اور بعد ازاں دہلی میں ہوٹل کا کاروبار کیا، جہاں ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی محفلیں سجتی تھیں۔ دہلی میں قیام کے دوران ان کی قربت معروف شاعر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سے ہوئی۔ بیدی صاحب کی پچھتّرویں سالگرہ کے موقعے پر قائم ہونے والے کنور مہندر سنگھ لٹریری ٹرسٹ میں انھیں جنرل سکریٹری کی ذمے داری سونپی گئی جب کہ کناٹ پلیس میں واقع ان کا دفتر ٹرسٹ کا مرکز بنا۔ نارنگ ساقی اپنی خوش اخلاقی، مہمان نوازی اور اردو سے والہانہ وابستگی کے لیے جانے جاتے تھے۔ انھوں نے ادبی سرگرمیوں کے فروغ اور اہلِ قلم کی حوصلہ افزائی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اردو کتابوں کی اشاعت اور تدوین میں انھیں خاص مہارت حاصل تھی۔ 'ہمارے کنور صاحب' اور 'یادوں کا جشن' سمیت متعدد کتابوں کی اشاعت میں ان کی خدمات شامل رہی ہیں۔ طنز ومزاح سے ان کی خصوصی دلچسپی تھی اور ان کی کتاب 'ادیبوں کے لطیفے' کو خاصی پذیرائی حاصل ہوئی۔ کنور مہندر سنگھ لٹریری ٹرسٹ کے پلیٹ فارم سے انھوں نے اردو ادیبوں اور شاعروں کی بھرپور سرپرستی کی۔ عمر کے آخری حصے تک وہ اشاعتی اور ادبی پروگراموں میں سرگرم رہے۔ 17 دسمبر 2025 کو ان کی شخصیت اور خدمات پر مبنی کتاب 'نارنگ ساقی: ایک مطالعہ' کی رسمِ اجرا انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں منعقد ہوئی تھی، اسی روز ان کی طبیعت ناساز ہوئی اور بعد ازاں وہ مسلسل علالت کا شکار رہے۔ اپنے آخری دنوں میں وہ فریدآباد میں اپنے چھوٹے بیٹے سنجیو نارنگ کے ساتھ مقیم تھے۔ طبیعت زیادہ بگڑنے پر 4 جون کو انھیں ایک مقامی اسپتال میں داخل کرایا گیا، جہاں 5 جون کو انھوں نے آخری سانس لی۔ خاندانی ذرائع کے مطابق ان کی آخری رسوم 6 جون کو دوپہر ایک بجے لودھی روڈ شمشان گھاٹ، نئی دہلی میں ادا کی گئیں۔ کرشن لال نارنگ ساقی کی وفات سے اردو دنیا ایک ایسے شخص سے محروم ہوگئی ہے جس نے اپنی زندگی اردو زبان، ادیب اور اہلِ قلم کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ ان کی ادبی، اشاعتی اور سماجی خدمات کو طویل عرصے تک یاد رکھا جائے گا۔

محمد احمد

نئی دہلی۔ روزنامہ 'قومی آواز' کے سابق پروف ریڈر اور پبلشنگ ادارے 'پرنٹ آرٹ' شیش محل کے مالک محمد احمد کا 3 جون 2026 کو انجمن میڈیکل سنٹر دہلی میں انتقال ہوگیا، جہاں وہ گزشتہ 6 ماہ سے زیرِ علاج تھے۔ ان کی عمر 78 برس تھی۔ لواحقین میں ایک بہن اور دو بھائی ہیں۔ ان کی تدفین ملکہ گنج قبرستان میں ہوئی۔ وہ 'قومی آواز' کے شعبۂ پروف ریڈنگ سے 28 سال تک وابستہ رہے۔ انھوں نے اپنے ادارے سے متعدد اہم دینی کتابیں شائع کی ہیں۔ چھوٹی مسجد اہلِ حدیث احاطہ کیدار خاں باڑہ ہندو راؤ کے کارکنوں سیّد اجمل حسین، سہیل انجم، عبدالکریم، منور شکوری، عبدالحیٔ خرم قیومی، مولانا عبدالحق، خلیق اعظمی، محمد ابراہیم اور ریحان ہاشمی کے علاوہ مئو اترپردیش کے معروف پبلشنگ ادارے 'مکتبہ الفہیم' کے مالک عزیز الرحمٰن اور ابوشعر فہیم نے بھی اظہارِ رنج وغم کیا اور ان کے لواحقین سے اظہارِ تعزیت کیا ہے۔ ابوشعر فہیم سے ان کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ انھوں نے ایک سال کے درمیان نصف درجن سے زیادہ مرتبہ اسپتال آکر ان کی عیادت کی تھی۔

زبیر احمد انصاری

امبیڈکرنگر۔ ضلع کے ہنسور قصبے سے روزنامہ 'انقلاب' کی نمائندگی کرنے والے سینئر صحافی زبیر احمد انصاری کا 14 اپریل 2026 کی شام تقریباً 5 بجے دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 78 برس تھی۔ تدفین رات ساڑھے نو بجے بھولے پور عیدگاہ کے سامنے واقع قبرستان میں عمل میں آئی۔ پس ماندگان میں تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ ان کی موت سے پورے علاقے میں سوگ کی لہر دوڑ گئی۔ مرحوم صحافی زبیر احمد انصاری اپنی سادہ اور ملنسار طبیعت کے لیے جانے جاتے تھے۔ ان کا ایک الگ سماجی مقام تھا اور وہ ہر طبقے اور ذات کے لوگوں کی خوشیوں اور غموں میں ہمیشہ شامل رہتے تھے۔ ان کے انتقال کی خبر ملتے ہی بڑی تعداد میں مقامی لوگ ان کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ اس موقعے پر علاقے کی سرکردہ شخصیات اور صحافیوں نے اظہارِ افسوس کیا ہے۔ تعزیت کا اظہار کرنے والوں میں محمد شفیع نیشنل انٹر کالج ہنسور کے استاد محمد اسلم خاں، فروغ انصاری، امداد اللہ انصاری، ڈاکٹر فیروز اختر، سمیع اللہ صدیقی، وسیم صدیقی، موضع کے سابق پردھان محمد کامل، بھولے پور گاؤں کے پردھان طارق انور، ہنسور کے پردھان کنہیا رام، دینک جاگرن کے صحافی آنند موہن، 'گاؤں تک' سوشل میڈیا کے صحافی ندیم شیخ، جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے رام شکل، برجیش پرجاپتی، وسیم صدیقی، شاہد اختر، سنیل سنگھ، شریف مسعودی، چاند اور دیگر ممبران شامل ہیں۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحومین کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

پروفیسر محمد شاہد حسین کے انتقال پر اُردو اکادمی دہلی میں تعزیتی نشست

نئی دہلی (21 مئی)۔ اردو اکادمی دہلی کی جانب سے اردو کے ممتاز محقق، نقاد، ڈراما نگار اور جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق استاد پروفیسر محمد شاہد حسین کے انتقال پر ایک تعزیتی نشست منعقد کی گئی۔ اس موقعے پر اکادمی کے سکریٹری لیکھ راج، افسران اور عملے نے مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ پروفیسر محمد شاہد حسین کی تحقیقی و تنقیدی خدمات اردو ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں جنھیں ہمیشہ قدر و احترام کے ساتھ یاد رکھا جائے گا۔ ان کے انتقال سے اردو دنیا، خصوصاً اردو ڈرامے کی تنقید وتحقیق کے میدان میں ایک بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے جسے پُر کرنا آسان نہیں۔ لیکھ راج نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ پروفیسر محمد شاہد حسین اردو ڈرامے کی دنیا کا ایک معتبر نام تھے۔ ڈرامے کے میدان میں ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اکادمی کے اسسٹنٹ پبلی کیشن آفیسر محمد ہارون نے کہا کہ پروفیسر محمد شاہد حسین نہ صرف ایک بہترین استاد تھے بلکہ اردو ڈرامے کے ممتاز محقق، نقاد اور ڈراما نگار بھی تھے۔ تعزیتی نشست کے اختتام پر مرحوم کے لیے ایصالِ ثواب، مغفرت اور درجات کی بلندی کے لیے دعا کی گئی۔

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : عرشی تاج پوری: احوال وآثار
مصنف : ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
اشاعت : 2025
ضخامت : 128 صفحات
قیمت : 200 روپے
ناشر : مکتبہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ
تبصرہ نگار : ڈاکٹر ابراہیم افسر
E-mail: ibraheem.siwal@gmail.com

زیر تبصرہ کتاب 'عرشی تاج پوری: احوال وآثار' میں ڈاکٹر الیاس الاعظمی نے خطۂ اعظم گڑھ سے تعلق رکھنے والے مولانا ابوالقاسم محمد فضل رب حنفی القادری معروف بہ عرشی تاج پوری کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں کو رسائل وجرائد کی دھول پھانکتی فائلوں کو صاف کر کے اوراقِ گم گشتہ ہونے سے محفوظ کیا ہے۔ موصوف نے مولانا عرشی تاج پوری کی ادبی فتوحات پر ناقدین اور محققین کی جانب سے برتی گئی غفلت اور بے اعتنائی پر شدید ردِ عمل کا اظہار کیا ہے۔ مولانا عرشی، علامہ شبلی کے ہم عصروں میں شامل تھے۔ یہاں تک کہ علامہ شبلی نے انھیں ندوۃ العلما کے دوسرے اجلاس میں شرکت کے واسطے حیدرآباد سے بلایا تھا۔ زیر نظر کتاب کو الیاس صاحب نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں عرشی تاج پوری کی شخصیت، تعلیم وتربیت، ملازمت، سیروسیاحت، ندوہ کے اجلاس میں شرکت اور شعری خدمات وغیرہ کا احاطہ کیا ہے۔ دوسرے حصے میں مولانا عرشی کے کتابچہ 'کارنامۂ عبرت' کا تنقیدی محاکمہ پیش کیا ہے۔

الیاس صاحب نے اس کتاب کی وجہ تصنیف کا ذکر حرفِ آغاز میں یوں کیا کہ ''راقم کی نگاہ میں سب سے پہلے ان کا نام 'حیاتِ شبلی' میں گزرا۔ پھر 'باقیاتِ نثرِ شبلی' کی تدوین کے زمانے میں علامہ شبلی نے ندوے کے جلسۂ سالِ دوم کی جو روداد لکھی ہے اس میں نظر آیا۔ بعد ازاں سخنورانِ حیدرآباد دکن کے بعض تذکروں میں کہیں کہیں ان کا ذکر ملا۔ اُردو شاعری کے عہد میں غالباً ان کی فارسی شاعری کی عدم قدردانی و شہرت کا سبب بنی اور ان کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاسکی'' (ص9)۔ مولانا عرشی کی شخصیت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے حیدرآباد دکن میں ملازمت کے سلسلے میں عمرِ عزیز کا طویل عرصہ گزارا۔ پچاسی برس کی عمر میں وہ سرزمینِ دکن میں پیوند خاک ہوئے۔ مولانا عرشی کی وفات کے سلسلے میں تذکرہ نویسوں میں نمایاں اختلاف ہے، لیکن الیاس صاحب نے اپنی تحقیق، محنتِ شاقہ اور دلائل سے یہ ثابت کیا کہ محمد عبدالجبار خاں بارری ملکاپوری کی کتاب 'محبوب الزمن تذکرہ شعرائے دکن' اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی کتاب 'داستانِ ادب حیدرآباد' میں مولانا عرشی کی جو تاریخِ وفات (1309ھ مطابق 92-1891) درج ہے وہ غلط ہے۔ الیاس صاحب نے اس ضمن میں لکھا ہے کہ ناچیز اس نتیجے پر پہنچا کہ عرشی تاج پوری کی وفات 1897 اور 1898 کے درمیان ہوئی ہے۔

مولانا عرشی تاج پوری نے اپنی ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن تاج پور (اعظم گڑھ) میں حاصل کی۔ مولانا عرشی نے سب سے پہلے گوالیر میں ملازمت اختیار کی۔ یہاں پر وہ مہاراجا گوالیر کے صاحب زادوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ آزاد پسند طبیعت ہونے کے سبب گوالیر سے حیدرآباد دکن کا رخ کیا۔ یہاں پر انھوں نے اپنے شعری کمالات کا مظاہرہ کیا۔ حیدرآباد میں ہی انھوں نے اپنا مشہور فارسی قصیدہ 'مدوجزر اسلامی' لکھا۔ الیاس صاحب نے اس قصیدے کے بارے میں لکھا ہے کہ مولانا عرشی کے ذہن میں مولانا الطاف حسین حالی کے افکار وخیالات بالخصوص 'مدوجزر اسلام' ہی سایہ فگن تھی، بالفاظ دیگر دونوں کی فکر ونظر میں بڑی مماثلت اور یکسانیت پائی جاتی ہے (ص33)۔ مولانا عرشی تاج پوری نے مذکورہ قصیدے کی طرز پر 'قصیدہ منیر نواز جنگ' لکھا۔ دراصل یہ قصیدہ مختار الملک کے صاحب زادے منیر جنگ کی شان میں کہا گیا تھا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی کتاب 'داستانِ ادب اُردو' میں اس قصیدے کے تین شعر نقل کیے ہیں۔ مولانا عرشی نے 1895 میں ندوۃ العلما کے دوسرے سالانہ جلسے کے لیے فارسی مثنوی بھی لکھی تھی۔ اس جلسے میں شرکت کے لیے مولانا عرشی تاج پوری، حیدرآباد دکن سے نظام حیدرآباد میر محبوب علی خاں کے ہم راہ آئے تھے۔ 1896 میں ندوۃ العلما کے تیسرے جلسے میں بھی مولانا عرشی نے شرکت کی۔ اس بار انھوں نے فارسی میں 'ترکیب بند' پیش کیا۔ 1897 میں ندوۃ العلما کے چوتھے اجلاس (منعقدہ میرٹھ) میں مولانا عرشی نے فارسی میں 'مقالہ' اور 'قومی نظم' پیش کی جسے اہلِ علم نے خوب پسند کیا۔

مولانا عرشی تاج پوری نے 'کارنامۂ عبرت' میں تجارت وصناعت و ہنر اسلامی ایجادات اور اس کی ترقی و تنزلی کے اسباب قارئین کے سامنے پیش کیے ہیں۔ یہ کتابچہ 1893 میں مفید عام آگرہ باہتمام محمد قادر علی خاں ولد احمد خاں صوفی مرحوم کی جانب سے شائع ہوا۔ اس کتابچہ میں شامل تمام مضامین مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ، حرفت و صنعت، تجارت وایجادات کا سراغ دیتے ہیں۔ مولانا عرشی نے اپنی تحقیق وتلاش سے اس کتابچہ کو واقعی 'کارنامۂ عبرت' بنادیا ہے۔ انھوں نے اُن اسباب کو بھی قارئین کے سامنے بیان کیا جن کی وجہ سے مسلم قوم کو عروج وزوال اور نشیب وفراز سے روبرو ہونا پڑا۔ انھوں نے اپنے مضامین میں تجارت کو مسلموں کے لیے فرضِ عین قرار دیا ہے۔ ان کی نظر میں کسی بھی قوم کی ترقی تجارت میں مضمر ہے۔ انھوں نے یہ بھی لکھا کہ جب تک مسلمان تجارت، حرفت وصنعت وایجادات میں منہمک اور وابستہ رہے وہ دنیا پر غالب رہے۔ اور جیسے ہی انھوں نے اپنے اخلاق، عادات واطوار میں سے تعلیم وتجارت کو نکال پھینکا ویسے ہی ان کا زوال ہونا شروع ہوا۔ اس بارے میں مولانا عرشی رقم طراز ہیں:

''مسلمانوں کی گذشتہ اور موجودہ تجارت پر بحث کرتے وقت مضمون نگار کا فرضِ منصبی ہے کہ تجارت کے ابتدائی زمانہ پر اوّل غور کرے کہ کب اور کس سنہ میں اس نے ظہور پکڑا اور کیوں کر قدم بہ قدم آگے بڑھا اور رفتہ رفتہ اس درجہ تک پہنچا کہ اپنی حیرت انگیز رفتار سے تمام عالم پر قبضہ کرلیا۔ تاریخی ہزاروں صفحے اُلٹ جایئے مگر اس کی تدریجی رفتار کا اندازہ ملنا تو ایک طرف یہ بھی پتا لگانا مشکل ہے کہ کس کس عہد میں اس کے باکمال موجدوں نے اس کی ایجادیں اور نئی اُمت نے اس کی اصلاحیں کیں اور کن کن قالبوں اور کن کن صورتوں سے یہ شاہدِ دل فریب بزم عالم میں جلوہ گر ہوا۔'' (ص82)

مولانا عرشی نے اپنے مضمون میں مسلم ممالک اور شہروں کی حرفت و صنعت پر بھی تبادلۂ خیال کیا ہے۔ انھوں نے مغربی ومشرقی ممالک بالخصوص اسپین اور ہندستان میں مسلمانوں کے ذریعے کی گئی ایجادات اور تجارتی نکات میں اصلاحات پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ابتدائی حرفت و صناعت کے بارے میں مولانا تاج پوری نے قرآن کی روشنی میں بتایا کہ سب سے پہلے دنیا میں گیہوں کو آدم علیہ السلام کے ذریعے بویا گیا۔ کپڑے کی ایجاد بھی ماں حوا کی عصمت و پاکیزگی کی وجہ بنی۔ 'اسلامی تحقیق اور ایجاد' کے باب میں مولانا عرشی نے کافی اہم معلومات قارئین تک بہم پہنچائی ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے مسلمانوں کے اندر تحقیقی شعور اور ذوق وشوق کے باب کو وا کیا ہے۔ شاعری کے حوالے سے انھوں نے لکھا ہے کہ شاعری کے موجد مسلمان ہیں۔ فرانس اور اٹلی وغیرہ میں شاعری کا شوق مسلمانوں ہی کی بدولت پیدا ہوا۔ اس مضمون سے ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں ایجادات وتحقیقات، تعلیم وتربیت پر دلائل کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے:

''مردم شماری آمد وخرچ کی تفصیل، سفر کے حالات، اوّل مسلمانوں ہی نے کتابوں میں درج کیا ہے۔ فرانس اور جرمن اور انگلستان کے لوگوں کو مسلمانوں ہی کے سبب سے سواری کا شوق ہوا اور گھوڑوں پر سوار ہونے لگے، ورنہ اہل یورپ شاذونادر گھوڑوں پر سوار ہوتے تھے۔ عورتیں، مردوں سے زیادہ علم کی شائق تھیں، قرطبہ اور مصر میں اکثر لیڈی ڈاکٹر یہی مسلمانوں کی عورتیں تھیں۔ ہامر جرمنی جس نے مسلمانوں کے ذکر میں سات جلدوں میں ایک تاریخ لکھی ہے، اہل اسپین کی نسبت لکھتا ہے کہ اسپین میں جو ترقی علوم و فنون میں مسلمانوں کی تھی اس کی تعریف محال ہے۔ مسلمانوں کا دماغ ان کا علمی ذوق، نہایت نازک اور پاکیزہ تھا، ان میں تہذیب کا وہ جوش تھا جو نہایت مہذب اور تربیت یافتہ قوم میں پیدا ہوسکتا ہے۔'' (ص101)

بہرکیف! زیر نظر کتاب میں ڈاکٹر الیاس الاعظمی نے اعظم گڑھ کے ایک گم نام اور مظلوم شاعر مولانا عرشی کے حالات وادبی خدمات کا جس انہماک کے ساتھ احاطہ کیا وہ قابلِ رشک ہے۔ انھوں نے سیّد سلیمان ندوی کی اس رائے سے بھی اختلاف کیا کہ علامہ شبلی کی فارسی بیاض کو مولانا عرشی تاج پوری نے غائب کیا تھا۔ حالاں کہ ندوی صاحب نے صرف سُنی سنائی بات کو نقل کیا، جب کہ یہ روایت غیر مستند حوالوں کے زمرے میں شامل کی جاتی ہے اور ایسی روایتوں کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنا لازمی ہے۔ البتہ الیاس صاحب نے اس ضمن میں احتیاط واعتدال سے کام لیا ہے۔ موصوف نے اس کتاب کا انتساب دادا مرحوم حاجی عبدالستار کے نام کیا ہے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ اعظم گڑھ کے اور دیگر گم نام شعرا وادبا کے کارناموں کو بھی الیاس صاحب منظرِ عام لانے کی کوشش کریں گے۔

•••

اردو ہندی ڈکشنری
انجمن ترقی اردو (ہند)
قیمت: 300 روپے

اسٹینڈرڈ انگلش اُردو ڈکشنری
مولوی عبدالحق
قیمت: 500 روپے

آل احمد سرور کی شبلی شناسی

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

حریت پسند اور روشن خیال بنایا جائے تو قوم کی وہ بہتر قیادت کرسکیں گے، خیال برا نہ تھا، لیکن علما کی تنگ خیالی نے ندوے میں شبلی کو کامیاب نہ ہونے دیا۔‘‘[7]

پھر سرور صاحب نے اثرات شبلی کا ذکر کیا ہے اور صراحت سے لکھا ہے:

’’شبلی کا اثر اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ ہوا۔ حالی نے اردو ادب کی دنیا بدل دی، مگر شبلی نے ہندوستان کے مسلمانوں کی ذہنی زندگی پر اثر ڈالا۔ انھیں اپنی چیزوں کی قدر کرنی سکھائی۔ انھیں ہندوستان سے باہر دوسرے اسلامی ممالک کے مسائل کو محسوس کرنے کا عادی بنایا۔ ان میں حقوق کی طلب اور خوشامدانہ سیاست سے بلندی پیدا کی۔ سیّد سلیمان، ابوالکلام، عبدالسلام ندوی، ظفر علی خاں، مولانا محمد علی، اقبال، سب پر سرسیّد سے زیادہ شبلی کا اثر ہے۔ اکرام نے یہ غلط نہیں لکھا ہے کہ نئی نسل سرسیّد سے زیادہ شبلی سے متاثر ہے۔ یہ اثر قدرتی تھا۔‘‘[8]

بعدازاں سرور صاحب نے سرسیّد اور سرسیّد تحریک اور علامہ شبلی کے غور و فکر کے انداز اور طریق کا موازنہ کیا ہے۔ سرسیّد کے دور آخر کی سیاسی فکر کی وضاحت کی ہے اور ماحصل کے طور پر لکھا ہے:

’’غالباً اب یہ واضح ہوگیا ہوگا کہ شبلی کی تحریک سرسیّد کی ضد نہیں تھی بلکہ اس کے ایک خاص رجحان کی اصلاح کر کے اس کی روح کو برقرار رکھنا چاہتی تھی۔‘‘[9]

سرور صاحب نے بہ دلائل ثابت کیا ہے کہ علما نئے مسائل کو سمجھنے کے لیے تیار نہ تھے اور انھوں نے علامہ شبلی کی روشن خیالی سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ البتہ وہ نئی نسل جن سے علامہ شبلی خود مایوس تھے، اس نے علامہ شبلی سے زیادہ استفادہ کیا۔ وہ نئی نسل پر علامہ شبلی کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’شبلی کے اثر سے نئی نسل میں اپنی تہذیبی میراث کا احترام آیا اور سستی مغربیت سے بیزاری۔ انھیں کے اثر سے مسلمانوں کی سیاست میں ترقی پسند اور حریت پسند عناصر پیدا ہوئے۔ انھیں کے اثر سے نیا نوجوان ہندوستان میں مسلمانوں کی بادشاہت کو خون کی ہولی سمجھنے کے بجائے اسے اصلی رنگ میں دیکھنے لگا۔ ان کی علمی تصانیف سے اس کے ذہن کو جلا ہوئی۔ ان کی نظموں کی چاشنی نے غیر محسوس طور پر اسے کچھ سیاسی اور سماجی قدریں عطا کیں۔ وہ انھیں کے سہارے ترکوں کے دکھ درد میں شریک ہوا۔ اسلام کی ابتدائی سادگی، خلوص اور جوش سے آشنا ہوا اور اپنے زمانے کے ہنگاموں اور معرکوں کو ایک بڑے سانچے اور ادارے کا جز بنا کر دیکھنے لگا۔ مسجد کان پور، شہر آشوب اسلام، ڈاکٹر انصاری کی واپسی، جنگ عظیم، لیگ سے خطاب، خطاب بہ احرار میں آج بھی وہی تازگی ہے جو ان کی تصنیف کے وقت تھی۔ سرسیّد کے جانشین مسلمانوں کو انگریز پرست بنا رہے تھے۔ شبلی نے انھیں روکا۔ شبلی کے بعد محمد علی، ابوالکلام اور اقبال نے نظم و نثر کے ذریعے سے انگریز پرستی کا سدباب کیا اور آج چند اربابِ غرض کے سوا مسلمانوں میں انگریز پرستی عام نہیں۔‘‘[10]

اس طرح سرور صاحب نے انتہائی معروضی انداز میں سرسیّد اور شبلی کے متعلق تمام اعتراضات اور الزامات کا تجزیہ کر کے واضح کردیا کہ علامہ شبلی علی گڑھ تحریک کے مخالف نہیں تھے بلکہ انھوں نے ایک نئے رجحان کے ذریعے اس تحریک کی کمیوں کا ازالہ کیا۔ خاص طور پر سرسیّد کے آخری دنوں میں جو ان کا سیاسی نقطۂ نظر تھا اس سے علامہ شبلی نے اختلاف کر کے جو نیا نظریہ پیش کیا وہ نہ صرف نئی نسل کے لیے بلکہ قومی مفادات کے تحفظ کے لحاظ سے بھی مفید تھا۔

سرور صاحب نے حالی و شبلی کی سوانح نگاری کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے:

’’شبلی نے سوانح نگاری کے ان اصولوں پر اعتراض کیا تھا جو حالی نے برتے، حالاں کہ شبلی نے جو سوانح عمریاں لکھی ہیں ان میں قریب قریب وہی اصول مدِنظر رکھے گئے ہیں۔ شبلی حالی سے زیادہ تحقیق و تلاش، واقعات کی چھان بین، مواد کی ترتیب و تہذیب پر زور دیتے ہیں۔ حالی کے نزدیک شخص اہم نہیں تھا۔... سوانح نگار کی حیثیت سے وہ حالی سے بلند نہیں کہے جاسکتے، وہ حالی کی طرح غیر جانب دار اور غیر شخصی بھی نہیں کہے جاسکتے، ہاں حالی سے زیادہ تفصیل پیش کرسکتے ہیں اور زیادہ وسعت پیدا کرسکتے ہیں۔‘‘[11]

شعرالعجم اور موازنہ انیس و دبیر کے بارے میں ان کا خیال ہے:

’’وہ بڑے اچھے محقق تھے اور خالص ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے ان کا پایہ بہت بلند ہے۔ اگرچہ شیرانی نے ان کی ’شعرالعجم‘ کی بعض غلطیوں پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور اگرچہ ’موازنۂ انیس و دبیر‘ دراصل موازنہ نہیں ہے مگر پھر بھی شبلی کے فیصلے اکثر و بیشتر صحیح اور ان کی تنقیدیں زیادہ تر پاکیزہ اور اچھے ادبی ذوق کی ترجمان ہیں۔‘‘[12]

خطوطِ شبلی کے بارے میں لکھا ہے:

’’شبلی کے خطوط میں ان خطوط کو خواہ مخواہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے جو انھوں نے عطیہ فیضی اور زہرا فیضی کو لکھے تھے۔ دراصل ’مکاتیبِ شبلی‘ ان کی علمی و ادبی زندگی کی بہتر ترجمانی کرتے ہیں۔‘‘[13]

سرور صاحب نے مقدمے کے آغاز میں حالی و شبلی کے موازنے کو ناپسندیدہ فعل قرار دیا ہے اور مہدی افادی کے مضمون حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک پر بھی معترض ہیں، مگر انھوں نے خود حالی و شبلی کی شاعری کا موازنہ کیا ہے اور جن نقادوں نے علامہ شبلی کی شاعری کی برتری دکھلائی ہے، ان سب پر تنقید نہیں کی ہے بلکہ ان کے نقطۂ نظر کو مسترد کردیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

’’یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ لطیف طنزیہ نظمیں لکھنے کا سہرا مولانا شبلی کے سر ہے۔ یہ بات کسی طرح مانی جاسکتی ہے کہ حالی کی شاعری شبلی کی شاعری کے مقابلے میں پھیکی اور کم رتبہ ہے اور یہ کہنا بھی خوش فہمی ہے کہ اگر شبلی اپنی تمام تر قابلیتوں کے ساتھ اردو شاعری کے لیے وقف ہوجاتے تو وہ اگر دوسرے فردوسی نہیں تو پہلے اقبال ضرور ثابت ہوتے، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ شبلی کی شاعری جو ان کی شگفتہ، لطیف اور رسا طبیعت کا کبھی کبھی کا ابال ہے۔ اپنے رس اور شعریت کے ساتھ ساتھ اچھی اور صالح سماجی قدروں کی بھی علم برداری کرتی ہے۔ شبلی کے یہاں تغزل ہے اور یہ تغزل محض گل و بلبل کی حکایت یا جوانی دیوانی کی داستان کے لیے نہیں، ملک و قوم کے مسائل اور تاریخ کے اوراق کی تشریح کے لیے استعمال ہوا ہے۔‘‘[14]

آخر میں سرور صاحب نے علامہ شبلی کی معنویت اور علما میں روشن خیالی کے خاتمے پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

’’افسوس ہے کہ علما میں شبلی جیسے روشن خیال اور دور بین اشخاص کم ہوئے ہیں۔ اس سے علما کو بھی نقصان پہنچا ہے اور ہندوستان کو بھی اور اب شاید ہمیشہ کے لیے ہندوستان کی ذہنی زندگی کی قیادت ان سے چھن گئی۔‘‘[15]

پروفیسر آل احمد سرور نے نسبتاً علامہ شبلی پر کم لکھا ہے، چند مضامین، چند دیباچے، مگر جس قدر لکھا ہے وہ ان کے انتہائی گہرے مطالعہ شبلی اور شبلیات کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ دراصل وہ خود افکار شبلی سے بہت متاثر تھے۔

حوالے:

۱۔ مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، عبداللطیف اعظمی، شبلی اکادمی، دہلی، مطبوعہ 1945، ص:2-1۔

۲۔ ایضاً، ص:4۔

۳۔ ایضاً، ص:5۔

۴۔ ایضاً، ص:6-5۔

۵۔ ایضاً، ص:7-6۔

۶۔ ایضاً، ص:7۔

۷۔ ایضاً، ص:9۔

۸۔ ایضاً، ص:9۔

۹۔ ایضاً، ص:11۔

۱۰۔ ایضاً، ص:12-11۔

۱۱۔ ایضاً، ص:13-12۔

۱۲۔ ایضاً، ص:13۔

۱۳۔ ایضاً، ص:14۔

۱۴۔ ایضاً، ص:15۔

۱۵۔ ایضاً، ص:16۔

641. Shaista Manzil, Pura Gulami,
Behind Awas Vikas
Azamgarh-276001(UP)
+919838573645
Email: azmi408@gmail.com

غالب انسٹی ٹیوٹ کا فخرالدین علی احمد یادگاری خطبہ

(بقیہ صفحہ 5 سے آگے)

غور سے نہ دیکھا جائے یہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ اس کے اجزا اتنے مختلف ہیں۔ یہاں کے طرزِ تعمیر کو ہی دیکھیے تو معلوم ہوجاتا ہے کہ اس میں مختلف اقوام کی طرزِ فکر کا جلوہ نمایاں ہے۔ عوامی اور شخصی تعمیرات کے علاوہ مذہبی عمارتوں میں بھی یہ رنگا رنگی آپ کو نظر آجائے گی۔ مسجد میں محراب اور گنبد سب سے نمایاں اجزا ہیں۔ گنبد رومیوں نے اور محراب سمیری والوں کی ایجاد ہے۔ اس کا اسلام سے ان معنوں میں کوئی رشتہ نہیں جس طرح ہمیں محسوس کرایا جاتا ہے۔ نہ کوئی طرزِ تعمیر اسلامی ہے نہ یہ غیر اسلامی انگریزوں کی پیدا کردہ تخصیص ہے جو انھوں نے خاص مقصد کے تحت پیدا کی تھی۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان گوشوں پر غیر جانبدارانہ انداز میں غور کریں کیوں کہ آزاد ملک کا مطلب صرف اپنا نظام نافذ کرنا نہیں ہے بلکہ آزاد فکر کا رواج بھی ہے۔ خطبے کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے چیئرمین اور سابق چیف جسٹس جموں و کشمیر جناب بدر دریز احمد نے کی۔ صدارتی تقریر میں انھوں نے کہا مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ یہ خطبہ جس معیار کے لیے جانا جاتا ہے آج سہیل ہاشمی صاحب کی گفتگو نے اسے ثابت بھی کیا۔ میں بھی ایک زمانے سے ان گوشوں پر سوچتا رہا ہوں اور کئی بار خود سے سوال کیا کہ جسے خالص کا نام دیا جاتا ہے اگر واقعی اسی کو اپنا لیا جائے تو ہم کتنی ایجادات سے محروم ہوجائیں گے۔ انسانی ایجاد کسی تقسیم کو نہیں مانتی۔ یہ اے آئی کا زمانہ ہے کیا ہم اسے کسی ایک قوم کی ایجاد کہہ سکتے ہیں؟ یقیناً اس میں دنیا کی اقوام نے اپنا حصہ ادا کیا ہے تب جا کر ہم کسی بڑی ایجاد سے فیض یاب ہوسکے ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے کہا: فخرالدین علی احمد یادگاری خطبہ اس لیے بھی بہت اہم ہوجاتا ہے کہ اس میں خالص ادبی گفتگو نہیں ہوتی بلکہ کچھ مختلف موضوعات کی تلاش کا عمل اسے منفرد بناتا ہے۔ سہیل ہاشمی کے کام سے ساری دنیا واقف ہے۔ ان کی معلومات اور حافظے سے وہ لوگ بہت متاثر ہیں جنھوں نے ان کی گفتگو سنی ہے۔ آخر میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے اظہار تشکر کیا۔

آل احمد سرور کی شبلی شناسی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

نامور ادیب اور نقاد پروفیسر آل احمد سرور (1911-2002) نے اپنی تحریروں میں علامہ شبلی نعمانی (1857-1914) پر کئی مقامات پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ ایک مضمون 'شبلی میری نظر میں'، ایک تبصرہ 'حیاتِ شبلی' اور ایک مقدمہ عبداللطیف اعظمی کی کتاب 'مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں' پر لکھا ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور نے علامہ شبلی کے کارناموں اور ان کے افکار کا جائزہ بڑی گہرائی اور بڑی باریک بینی سے پیش کیا ہے اور تقریباً تمام پہلوؤں کا بڑا منصفانہ تجزیہ کیا ہے۔ طویل مقدمے کے چند خاص پہلوؤں اور سرور صاحب کی چند منفرد رایوں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ عبداللطیف اعظمی کی کتاب 'مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں' کے مقدمے کا آغاز ان لفظوں سے کرتے ہیں:

> ''شبلی پر لکھنے کے لیے کسی اعتذار کی ضرورت نہیں، وہ ہماری ذہنی زندگی کے معماروں میں ہیں۔ انھوں نے اپنی عمر کے چالیس سال علمی کاموں میں بسر کیے۔ انھوں نے بہت سے عملی کام بھی کیے اور ان میں کامیابی بھی حاصل کی مگر وہ محض اپنے عملی کاموں کی وجہ سے شاید اتنے مشہور نہ ہوتے اگر ان کاموں کے پیچھے ایک مسلسل، اہم اور پرزور علمی و ذہنی تحریک نہ ہوتی۔ مہدی افادی نے انھیں تاریخ کا معلمِ اول کچھ غلط نہیں کہا ہے۔ انھوں نے اردو میں تاریخی ذوق پیدا کیا، خود بڑی اچھی سوانح عمریاں اور تاریخیں لکھیں اور تحقیق و تدقیق واقعات کی چھان بین اور مآخذ کی تلاش اور تاریخ میں ایک صاف اور واضح نقطۂ نظر ان سب کی اہمیت دکھائی اور جتائی۔ انھوں نے ادب، سیاست، تعلیم، مذہب، فلسفہ سب کو متاثر کیا اور سب پر اپنا کچھ نہ کچھ نقش چھوڑا۔ وہ بڑی جامع اور ہمہ گیر طبیعت رکھتے تھے۔ انھوں نے اردو متن کا دامن بہت وسیع کیا اور اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا، مگر اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے نظم میں بھی اپنی رنگینی، پُرجوش اور مزےدار سیاسی، اخلاقی اور تاریخی نظموں سے ایک خوش گوار اضافہ کیا۔ ان کے اسلوب میں ایک شگفتگی، بانکپن اور چستی ملتی ہے۔ شبلی کے یہاں عالمانہ شان ہے مگر خشکی نہیں، شبلی زاہد خشک نہیں تھے وہ شاعر بھی تھے۔''[۱]

ایک زمانے میں حالی و شبلی کا موازنہ عام بات تھی اور اس پر اہلِ قلم نے خوب طبع آزمائی کی۔ کسی نے مولانا حالی کو بڑھایا تو کسی نے علامہ شبلی کو، کسی نے مولانا حالی کی کسی خوبی کا ذکر کیا تو کسی نے علامہ شبلی کی عظمت بیان کی۔ آل احمد سرور نے اسے ناپسندیدہ طرزِ عمل قرار دیا ہے۔ اس کا آغاز مہدی حسن افادی کے مضمون 'حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک' سے ہوا۔ سرور صاحب نے اس کا ذکر کیا ہے اور پھر اسے نہ صرف غلط طرزِ عمل قرار دیا ہے بلکہ علامہ شبلی کے اقتباسات اور خیالات سے ان کے دل میں مولانا حالی کی جو عظمت تھی، بیان کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ علامہ شبلی نے ان کی تمام تصانیف کی تحسین و ستائش کی ہے سوائے 'حیاتِ جاوید' کے۔ اس میں بھی علامہ شبلی کو مصور پسند تھا، اس کی بنائی ہوئی ایک تصویر ناپسند تھی۔[۲]

شیخ محمد اکرام نے اپنی کتاب 'یادگارِ شبلی' میں علامہ شبلی کو سرسیّد کا حریف بنا کر پیش کیا ہے۔ سرور صاحب نے ان کے اقتباس کو نقل کر کے لکھا ہے:

> ''ان حوالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اگر چشمک تھی تو سرسیّد اور شبلی کی تھی۔ اس پر میں ذرا تفصیل سے لکھنا چاہتا ہوں، کیوں کہ شیخ اکرام نے شبلی کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے۔ انھوں نے [کسی ایک] سطح پر اختلافات کو دیکھا ہے اور یہ نظر انداز کر دیا ہے کہ اس کے وجوہ کس قدر گہرے، بنیادی اور اساسی تھے۔''[۳]

پھر انھوں نے مذکورہ بنیادی اور اساسی وجوہ کو قدرے تفصیل سے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''شبلی کو شبلی سرسیّد نے بنایا۔ شبلی مغرب تک سرسیّد کے واسطے سے پہنچے۔ سرسیّد کے کتب خانے، ان کی صحبت، علی گڑھ کی علمی صحبتوں اور آرنلڈ کی رفاقت نے شبلی کو ایک نیا ذہن اور ایک نیا مزاج دیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کی سخت حنفیت سرسیّد کے اثر سے اعتزال اور عقلیت میں تبدیل ہو گئی لیکن ایک زمانہ وہ آتا ہے جب سرسیّد کی ذہنی قیادت پیرِ تسمہ پا کا کام کرتی ہے اور شبلی اس سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ شبلی نے سرسیّد کی تعریف میں 'صبحِ امید' لکھی لیکن ان کی سوانح لکھنے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر ان کے مرنے پر صرف اردو ادب پر ان کے احسانات بیان کیے اور کچھ نہ لکھا۔ حالی بھی ایک زمانے میں 'حیاتِ جاوید' لکھنے کا ارادہ ترک آ چکے تھے۔''[۴]

مولوی عبدالحلیم شرر کا بیان ہے کہ شبلی سرسیّد کی فوج کے ایک نامی پہلوان ہونا گوارا نہیں کرتے تھے۔ انھیں خود قیادت کی ہوس تھی۔ اس کے بارے میں سرور صاحب نے لکھا ہے:

> ''میرا خیال ہے شبلی جس دبستان کے فرد تھے وہ سرسیّد سے متاثر ہونے کے باوجود سرسیّد کی ہر معاملے میں تقلید اور ہم نوائی نہیں کر سکتا تھا۔ شبلی محسن الملک نہ تھے جو سرسیّد کے سجادہ نشین ہونا چاہتے ہوں۔ وہ سرسیّد کے جانشین ہو بھی نہیں سکتے تھے۔
>
> بات یہ تھی کہ شبلی پرانے اسکول کا وہ ستارہ تھے جو اپنی فضا سے ٹوٹ کر سرسیّد کی دنیا میں پہنچ گیا تھا، مگر اپنی دنیا کی چیزیں بھی ساتھ لیتا گیا تھا۔ شبلی قدیم علوم کے فاضل تھے، سرسیّد نہ تھے۔ شبلی نے جس گہوارے میں تربیت پائی تھی وہ کچھ زیادہ سرکار پرست نہ تھا۔ سرسیّد مغرب و مشرق کے ملاپ کی خاطر سرکار پرست بنے تھے۔ یہ ان کا نئی نسل پر بہت بڑا احسان ہے۔ وہ اس دور کے بانی اور راہنما ہیں۔ ان کی تحریک سے ہماری مردہ زندگی میں کتنی زندگی پیدا ہوئی۔ اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں، لیکن ۱۸۵۷ء اور ۱۸۸۷ میں کچھ فرق ہونا چاہیے تھا۔ سرسیّد سیاسیات کے اس فرق کو نمایاں کرنے کے خلاف تھے۔''[۵]

آلِ احمد سرور صاحب نے سرسیّد اور شبلی کے مزاج اور فکر و نظر کے اختلاف کے طویل تجزیے کے بعد لکھا ہے:

> ''سرسیّد انگریزوں کے بڑے مداح اور انگریزی طریقِ حکومت کے بہت بڑے طرفدار تھے۔ شبلی انگریز پرستی سے چڑتے تھے۔ سرسیّد کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی آخر عمر کی سیاست سے — جب وہ بیک صاحب کے اشاروں پر حرکت کرتے تھے — اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ شبلی سرسیّد کی لائف اس لیے نہ لکھ سکتے تھے کہ وہ سرسیّد سے کچھ آگے دیکھ رہے تھے۔ سرسیّد کا دور علی گڑھ تحریک کا پہلا دور ہے۔ شبلی کا دوسرا۔ اس فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ شبلی نے علی گڑھ کو چھوڑا اور ندوے کی دنیا آباد کی۔ یہ محض خودسری نہ تھی ایک سنجیدہ مقصد اس کی تہہ میں تھا۔''[۶]

طویل تجزیے کے بعد سرور صاحب اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

> ''سرسیّد کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ علمی جدوجہد، تصنیف و تالیف، ذہنی قیادت، تہذیبی کوششیں، نئی نسل کے مقابلے میں شبلی اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے زیادہ ہوئیں، سرسیّد نئی نسل کو ہندوستان کی قیادت سپرد کرنا چاہتے تھے، یہ خیال غلط نہ تھا، لیکن انھوں نے نئی نسل کی صحیح تربیت پر توجہ نہ کی اور انھیں سرکاری ملازمت کی طرف ڈھکیل دیا۔ شبلی نئی نسل (انگریزی خواں طبقہ) سے مایوس تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر علماء کو ...

(بقیہ صفحہ 7 پر)

ادارے کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر : محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
معاون مدیران: منور حسن کمال، سالم فاروق ندوی
Assisistant Editors :
Munawwar Hasan Kamal, Salim Farooq Nadwi
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، روڈگراں، لال کنواں، دہلی-٦
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***